"پتھر نہیں ہوں میں": ایک عہد کی داستان

ڈاکٹر علی بیات
نجم الحسن خان

Abstract

"Pathar Nahin Hoon Main" is the autobiographical narrative of Dr. Khwaja Muhammad Zakaria, presenting the coherent, engaging, and intellectually rich account of a principled, accomplished, and widely-read scholar's life. In this volume, the author documents all the spoken and unspoken events of his life—from his birth to the tumultuous period of the creation of Pakistan and up to the present age—with remarkable simplicity, honesty, and intellectual grace. The cultural atmosphere, social landscape, and personal experiences associated with cities such as Amritsar, Jhang, and Lahore are portrayed with such vivid clarity that the reader feels as if the author's entire life journey unfolds before their eyes. The tragic incidents of 1947, the bitter experience of migration, the anguish of Partition, the psychological impact of violence, and the hardship of continuous displacement from city to city are narrated not merely from a literary standpoint but through the sensitive lens of a deeply perceptive human being leaving a profound imprint on both heart and mind. This autobiography, while recounting the life of a writer, teacher, and researcher, simultaneously addresses numerous historical, social, political, and scholarly questions with authenticity.

Keywords: Pathar Nahin Hoon Main, Autobiography, Subcontinent, Creation of Pakistan, Amritsar, Jhang, Lahore

آپ بیتیوں اور سوانحِ حیات کے مطالعے کا بنیادی مقصد محض کسی فرد کی حالاتِ زندگی کی معلومات کا حصول ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے شخصیت، عہد، معاشرت اور تہذیب کو سمجھنا بھی ہے۔ یہ مطالعہ قاری کو کسی شخصیت کے ذہنی ارتقاء، نفسیاتی کیفیت، جذباتی کشمکش اور فکری تشکیل سے آگاہ کرتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس دور کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر کو بھی روشن کرتا ہے(۱)۔ مشاہیر کی جدوجہد، کامیابیاں اور ناکامیاں قاری کے لیے حوصلہ، رہنمائی اور عملی زندگی کے اصول فراہم کرتی ہیں، جبکہ ادیبوں، شاعروں اور مفکرین کی آپ بیتیاں ان کے تخلیقی عمل، فکری نظریات اور ادبی رجحانات کو سمجھنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ صنف تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کے لیے قیمتی مآخذ فراہم کرتی ہے، کیونکہ ان کے ذریعے محققین، شخصیات اور تحریکوں کے ادبی دھاروں کا تجزیہ بآسانی کر سکتے ہیں۔ یوں آپ بیتیوں اور سوانحِ حیات کا مطالعہ نہ صرف شعور میں وسعت پیدا کرتا ہے بلکہ قاری کو انفرادی نفسیات، اجتماعی تاریخ، اخلاقی اقدار اور فکری رجحانات کے ادراک کا موقع بھی فراہم کرتا ہے(۲)

"پتھر نہیں ہوں میں" خواجہ محمد زکریا کی خود نوشت ہے۔ ان کی ۸۷ سالہ بھرپور زندگی کی کئی جہات ہیں۔ چونکہ وہ باقاعدہ ادبیات اردو کی تدریس سے وابستہ رہے اس لیے ان کی زیادہ تر جہات کا تعلق ادبیات اردو سے ہے۔ جہاں تک "پتھر نہیں ہوں میں" کا تعلق ہے ۲۳ عنوان کے تحت ۵۲۸ صفحات پر مشتمل آپ بیتی کو الحمد پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۲۵ء میں شائع کیا ہے۔ انتساب گھرانے

کے جملہ افراد کے نام ہے اور آغاز کے صفحے کے بعد آپ بیتی کے مشتملات کی فہرست سے پہلے مجید امجد کے طویل بحر کے ایک شعر سے آغاز ہوتا ہے۔ یہ ایک کام یاب اور اصول پسند انسان کا زندگی نامہ ہے جس میں علم، ادب، سیاست اور عملی حیات کی بو قلمونی نظر آتی ہے۔ امر تسر میں پیدا ہوئے، ہجرت کر کے جھنگ میں قیام کیا اور جھنگ میں ۱۱ / سال گزارنے کے بعد لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ مختلف شہروں کے حالات، ہجرت کے واقعات ان کی ابتدائی زندگی کے بنیادی موضوعات ہیں۔ آپ بیتی کا عنوان فیس بک فرینڈز کی مشاورت سے "پتھر نہیں ہوں میں" انتخاب کیا جو کہ غالبؔ کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

دائم پڑا ہوا ترے در پہ نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

البتہ انھوں نے اپنے مزاج کو اس شعر کے برعکس قرار دیا اور درج ذیل شعر کو زندگی کا عکاس قرار دیا ہے۔(۳)

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

خواجہ محمد زکریا صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز بطور شاعر ہوتا ہے اور ان کی ابتدائی شاعری لائل پور کے اخباروں اور مختلف شہروں سے شائع ہونے والے رسائل جیسے راوی وغیرہ میں شائع ہوتی رہی لیکن وہ کبھی اپنی ابتدائی شاعری سے مطمئن نہیں ہوئے اور اس کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے کہ "مجھے ان میں تقلیدی غزل گوئی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا"(۴). البتہ بعد میں جاپان میں قیام کی فراغت نے ان کے اندر خوابیدہ شاعر کو بیدار کیا اور یہی وجہ ہے کی چالیس / ۴۰ کے قریب تصانیف و تالیفات میں ان کے دو شعری مجموعے شامل ہیں۔(۵) مختلف شہروں میں قیام کے احوال کے علاوہ بطور طالب علم جھنگ کے اسکول اور کالج کے علاوہ لاہور کے گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج سے وابستگی کو بطور خاص موضوع بنایا گیا۔ مزید یہ کہ بطور طالب علم کیا کیا دلچسپیاں رہیں اور ادب کی طرف رغبت کے کیا بنیادی وسائل و اسباب رہے۔ آپ بیتی بظاہر تو ایک شخص کے واقعات و حالات ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ تاریخ و تہذیب بھی سفر کرتے ہیں۔(۶) اس خود نوشت میں بھی جابجا تاریخی و تہذیبی عناصر کی نمایاں عکاسی ملتی ہے۔

پروفیسر خواجہ محمد زکریا، امر تسر میں ۴ / نومبر ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے لیکن ان کی سند پر ۲۳ / مارچ ۱۹۴۰ء درج ہے، کیوں کہ ان دنوں اندازاً تاریخ پیدائش کسی اہم واقعہ کے دن کی نسبت سے درج کر دی جاتی تھی اس لیے ان کی تاریخ پیدائش ۲۳ / مارچ ۱۹۴۰ء ان کی والدہ کی کسی عزیزہ نے اس اہم دن اور سال کی مناسبت سے لکھی ہو گی۔ ایک سنی سنائی روایت کے مطابق وہ ۱۱ / رمضان کو پیدا ہوئے تھے۔ اگر عیسوی تقویم کے مطابق ہجری تقویم کو دیکھا جائے تو ۴ / نومبر ۱۹۳۸ء ان کی تاریخ پیدائش بنتی ہے(۷)۔ امر تسر میں قیام پاکستان تک نو سال زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ زندگی کے ابتدائی پانچ سال کو منہا کیا جائے تو یادوں کی جھلمل کے چار سال کو جس انداز میں انھوں نے اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے ان کی بے پناہ یادداشت کا عکاس ہے۔ ان کے بقول وہ پڑھا کو بچے نہیں تھے بلکہ محض اردو پڑھنے لکھنے میں اچھے تھے۔ باقی بہن بھائیوں کی نسبت تعلیم میں بہت کمزور تھے۔ ان کی اس طرح کی عاجزی کا کوئی ایک آدھ واقعہ بیان نہیں ہوا بلکہ کسی بھی مقام پر انھوں نے اپنے آپ کو بڑی شخصیت کے طور پہ منوانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک عام طالب علم، انسان، ادب دوست اور اعتدال پسند کے طور پر خود کو پیش کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے بہت سارے ادبی کارنامے ادبی افق پر مہر تاباں ہیں۔ لیکن انھوں نے کہیں بھی خود ثنائی یا انھیں کارنامے کے طور پر یاد کرنے کی بجائے یہی تحریر کیا ہے کہ اس تصنیف یا تالیف کو

لوگوں نے بہت سراہا ہے۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند کی ضخیم چھے جلدیں اور بہت سے شعری کلیات کی تدوین انتہائی اہم کارنامے ہیں لیکن آپ کو کہیں پر بھی ان کے یہاں تفاخر و مباحات اظہار نہیں ملے گا۔

"پتھر نہیں ہوں میں" ان کی پیدائش سے یعنی قیام پاکستان سے اب تک کی کہی ان کہی کہانی ہے۔ اتفاق سے برصغیر پاک کے اور اردو ادبی دنیا کے اہم موضوعات اس میں یکجا ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد شہر در شہر بالخصوص امرتسر، جھنگ، لاہور جیسے چھوٹے بڑے شہروں میں زندگی کی تصویر خود نوشت میں واضح رنگوں میں اجاگر ہوتی ہے۔ اگر زمانی ترتیب مد نظر رہے تو ایک آٹھ نو برس کا بچہ ۱۹۴۷ء کے پہلے کے واقعات، ہجرت کا تجربہ، تقسیم کا کرب، قتل و غارت کا نفسیاتی اثر،، شہر در شہر مسافرت و مہاجرت کا قلق، یہ سب کچھ دل و دماغ پر نقش کیے بعد کے ایک ادیب اور استاد کی کہانی کے روپ میں کئی تاریخی، سیاسی، علمی سوالات کا جوابات کا حوالہ ہے۔

نو برس کا بچہ ایک طالبعلم ہے جو لائن کے دونوں طرف کے حالات کی کہانی کو اپنی آپ بیتی میں غیر محسوس طریقے سے آشکار کرتا جاتا ہے۔ ادبی وابستگی و لگاؤ کا آغاز ہجرت کے بعد کا ہے کیوں کہ بلوغ سے پہلے کی ذہنی روش مختلف منازل کے لیے رستے کے انتخاب میں گومگوں کیفیت سے دوچار رہتی ہے۔ ابتدائی کلاس سے دیگر مضامین کی نسبت اردو کی طرف رغبت انھیں میٹرک کے بعد ادبیاتِ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے محکم ارادے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ پختہ عزم نجومی کی پیش گوئی کو شکست فاش سے دوچار کرتا ہے نجومی نے خواجہ صاحب کی والدہ سے کہا تھا کہ آپ کے دو بیٹے ذہین اور تیسرا نالائق، کند ذہن ہو گا۔ اگرچہ ابتدائی کلاسز کے نتائج اور ان کی کم دلچسپی ان کی والدہ کے خیال کو تقویت پہچا رہے تھے لیکن ان کی اردو سے دلچسپی کامیابی و کامرانی کا تسلسل ثابت ہوتی گئی۔ ایم۔اے تک وہ ایک پختہ کار محقق کے طور پر منوا چکے تھے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے فرسٹ ڈویژن سے ایم اے پاس کرنا، مقالے میں نوے فی صد نمبر حاصل کرنا اور بیرونی ممتحن ڈاکٹر غلام مصطفی خان جیسے محقق سے داد و تحسین ملنا یقیناً ان کے تحقیقی مزاج کا عکاس تھا۔ خواجہ محمد زکریا کی آپ بیتی کے "تئیس عنوانات کو چند بنیادی نکات میں سمیٹا جائے تو ترتیب کچھ یوں ہو گی:

۱۔ امرتسر میں زندگی کے ابتدائی دن

۲۔ ہجرت اور جھنگ میں قیام کے گیارہ سال

۳۔ لاہور میں اعلیٰ تعلیم، ملازمت اور مستقل سکونت

۴۔ چین جاپان، برطانیہ اور امریکہ کے اسفار کی کہانی

۵۔ خانوادے کا اجمالی تعارف اور اپنے علمی و ادبی سفر کا اجمالی خاکہ

امرتسر سے لاہور اور پھر لاہور سے جھنگ کو ہجرت کی۔ اس وقت ان کی عمر نو برس اور وہ چوتھی جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ چوں کہ امرتسر سے کم سنی میں ہجرت کر آئے تھے اور لڑکپن و نوجوانی جھنگ میں گزارے اس لیے امرتسر سے زیادہ جھنگ کی یادیں اور جھنگ سے دلی لگاؤ ان کی تحریر و تقریر میں آج تک نمایاں ہیں۔ جھنگ کے بہت سے اساتذہ، شعرا، ادبا اور ہم جماعتوں کا تذکرہ تواتر سے ملتا ہے۔ قیام جھنگ کے دنوں میں جھنگ کے ادبی حلقے بہت زیادہ سرگرم تھے۔ شعری و ادبی محافل تواتر سے ہوتی رہتی تھیں جس میں مقامی اور دوسرے شہروں کے بڑے شاعر شرکت کرتے تھے۔ ان دنوں جھنگ ایک ادبی دبستان سے کم نہ تھا۔ جدید اردو نظم کے بانی مجید امجد، غزل اور کیٹوز کے منفرد شاعر جعفر طاہر اور شیر افضل جعفری اپنی انفرادیت کے باعث بہت مقبول تھے۔ اردو کے بڑے شعرا کی بزم میں مہاجر شعرا کی شمولیت اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ جھنگ میں خواجہ محمد زکریا کا زمانہ طالب علمی

میں بنیادی مشغلہ ان محافل میں شرکت اور شعر ادبا سے علمی و ادبیمباحثے، ان کے ادبی ذہن کو پختہ سے پختہ کار بنانے میں معاون ثابت ہو رہے تھے

جھنگ ایک چھوٹا مگر تاریخی شہر ہے۔ ۱۹۴۷ء کے وقت شہر کی صورت حال کا عکس شاید، اسلامیہ ہائی سکول کا لفظی نقشہ ہو۔ شہر اور صدر (مگھیانہ) کی شمالاً جنوباً تقسیم ہو، سال بہ سال سیلاب کی شہر میں تباہ کاریوں کا ذکر ہو یا شہر کے چند گنے چنے تاریخی و تفریحی مقامات کا تذکرہ، ان تحریروں کیصورت ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ شاید ہی جھنگ کی نسل نو میں سے کوئی ایسی تاریخ سے آگاہ ہو۔ بے خبری اور کم آگہی کی بنیادی وجہ تاریخ کا محفوظ نہ ہونا ہے اگر کسی کو کچھ معلوم ہے تو محض سینہ در سینہ معدوم ہوتی ہوئی تاریخ ہے۔ اہلیان جھنگ کو خواجہ محمد زکریا کا سپاس گزار و ممنون ہونا چاہیے کیوں کہ انھوں نے جس طرح ادبی دنیا میں جھنگ کے مشاہیر اور بالا خص مجید امجد کو متعارف کرایا ہے۔ احسان عظیم سے کم نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء کے جھنگ شہر (صدر اور سٹی) کا نقشہ ملاحظہ ہو:

> "جھنگ صدر (مگھیانہ) میں ہمیں میونسپل کمیٹی کے دفتر کے قریب ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ نزدیک ہی تانگوں کا اڈا تھا جہاں سے سواری کے تانگے جھنگ شہر جایا کرتے تھے۔ دفاتر اور کچہریاں وغیرہ مگھیانے میں تھیں اس لیے جھنگ شہر سے لوگوں کو مگھیانہ آنا پڑتا تھا چنانچہ یہ اڈا ہمہ وقت آباد رہتا تھا۔ اس اڈے سے ایک سڑک جنوب کی طرف دو موڑ مڑ کر جھنگ بازار جا پہنچتی تھی جہاں سبزی منڈی واقع تھی۔ ہمارا گھر تانگوں کے اڈے سے جھنگ بازار کو جانے والی سڑک پر واقع تھا۔ اڈا گھر سے نظر آتا تھا اور پیدل ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔ چنبیلی مارکیٹ کہلانے والی گلی کا یہ پہلا مکان تھا۔ اس گلی کا یہ نام کیوں رکھا گیا؟ کچھ معلوم نہیں۔ بظاہر چنبیلی سے اس کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔
>
> میونسپل کمیٹی کا دفتر خاصے وسیع قطعہ اراضی پر مشتمل تھا۔ پودے اور رنگارنگ کے پھول لگے ہوئے تھے۔ بعض خودرو پھل دار معمر درخت بھی تھے۔ بچے املی اور آم کی چھوٹی چھوٹی کچی کیریاں بھی نہیں چھوڑتے تھے اور سب کچھ ہضم کر جاتے تھے۔ کمیٹی کے دفتر کے ساتھ ہی ایک مندر تھا جو ایک وسیع تالاب کے اندر تعمیر کیا گیا تھا۔ تالاب اتنا بڑا تھا جتنا کرکٹ گراؤنڈ ہوتا ہے۔ تالاب خشک رہتا تھا لیکن اس زمانے میں جب کبھی چناب میں سیلاب آتا تو پانی شہر میں داخل ہو جاتا اور تالاب لبالب بھر جاتا اور لوگ اس میں تیرتے تھے۔ چونکہ تالاب کی تہ تک سیڑھیاں اترتی تھیں اس لیے ہم جیسے تیرا کی نہ جاننے والے بھی اوپر والی سیڑھیوں پر نہا لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ پانی خشک ہو جاتا تو تالاب کھیل کے میدان کا کام دیتا۔ مندر ویران پڑا تھا۔۔۔ ہمارے گھر سے شمال مغرب کی جانب کھیت نظر آتے تھے۔ جھنگ جانے والی سڑک کے دو رویہ کھیت ہی کھیت تھے۔ سڑک کے ساتھ ہی بائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا تخمی آموں کا باغ بھی تھا۔ کالج کو عبور کرتے ہی کھیت کی بجائے ریت کے ٹیلے نظر آنے لگتے اور جھنگ شہر تک یہی منظر چلا جاتا۔"(۸)

یہ تصویر آج سے لگ بھگ پچاس سال پہلے کی ہے اب نہ توریت کے ٹیلے ہیں اور نہ ہی تلاب کمیٹی اور ریل بازار کے ساتھ کھیت نظر آتے ہیں۔ آبادی کا بے ہنگم اضافہ بھی خواجہ صاحب کی تصویر کشی میں زیادہ تبدیلی کا باعث نہیں بنا لیکن پسماندگی، آلودگی کے نکاسی کا ناقص نظام اور شہری مسائل نے عام آدمی کی زندگی کو بہت متاثر کیا ہے۔

خواجہ محمد زکریا صاحب کا جھنگ میں قیام، خود ان کی شخصیت اور اہلیانِ جھنگ کے لیے نعمت سے کم نہ تھا۔ انھوں نے شعری اور ادبی محافل اور جھنگ اور باہر کے بڑے شعرا سے میل ملاقات سے بھرپور استفادہ کیا۔ کالج میں جابر علی سید جیسے استاد سے استفادہ کیا ، شعری محافل میں مجید امجد، جعفر طاہر، شیر افضل جعفری جیسے مقامی اور عدمؔ، حبیب جالب، خلیق ملتانی جیسے دوسرے شہروں سے آئے شعرا کی شعری و ادبی نشستوں سے استفادہ کیا۔ بلاشبہ ان محافل نے ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں اہم کردار کیا لیکن جب خواجہ صاحب کو اللہ تعالی نے عزت بخشی اور عہدے ملے تو انھوں نے جھنگ کے بیش تر شعرا کو متعارف کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس بات سے نہ صرف ادبی دنیا بلکہ تمام جھنگ متفق ہے کہ مجید امجد کو آج تک جو پذیرائی ملی وہ سب جناب خواجہ محمد زکریا کے توسط سے ممکن ہوئی۔ مجید امجد پر ان کی تخصیص ان کے نمائندہ اختصاصات میں سے ہے۔ اس کے علاوہ نوائے وقت میں اپنے کالموں میں وقتاً فوقتاً جھنگ کے شعرا کو موضوع بناتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قحط الرجال میں اپنے شہر سے محبت کی یہ شان دار مثال ہے۔

خواجہ محمد زکریا کی آپ بیتی "پتھر نہیں ہوں میں" میں لاہور میں قیام کا حصہ سب سے زیادہ مفصل ہے کیوں کہ لاہور میں قیام ۱۹۵۸ء سے اب تک ۲۰۲۵ء کے لگ بھگ سڑسٹھ سال پر محیط ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے دو سال، اورینٹل کالج سے ایم اے (اردو) اور ایم اے کے بعد سے ریٹائرمنٹ تک اور بعد میں اب تک بہطور پروفیسر امیریٹس کے تجربات و مشاہدات کو آسان فہم اور رواں اسلوب میں درج کیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے. ایف اے فسٹ ڈویژن سے پاس کر کے بڑے بھائی (جو صاحب الرائے تھے) اور والدہ صاحبہ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلے کے رضامند کر لیا۔ ۵۸ء میں داخلہ لیا اور بی۔ اے بھی فسٹ ڈویژن سے پاس کیا (۵۰۰/۲۹۵ نمبر تھے۔ یعنی ۵ نمبر کم تھے اور اس وقت رعایتی نمبروں کا قانون نہیں تھا لیکن بعد میں اضافی نمبروں کے ساتھ فسٹ ڈویژن شمار کی گئی)۔ بی۔اے کے بعد مختلف اداروں اور مختلف مضامین میں ایم۔ اے کے داخلے کی سوچ بچار ہوتی رہی اور آخر کار بھائی کی رضامندی کے بغیر اورینٹل کالج میں ایم۔ اے اردو میں داخلہ لے لیا حالاں کہ جی سی میں ایم اے انگریزی میں داخلہ ہو گیا تھا لیکن فیس جمع نہیں کرائی تھی۔ نہ صرف ایم اے اوّل آئے بلکہ فسٹ ڈویژن بھی حاصل کی۔ اوّل آنا شاید تعجب خیز نہ تھا کیوں کے ہر سال کوئی نہ کوئی اول، دو آتا رہتا ہے لیکن فسٹ ڈویژن کے ساتھ گولڈ میڈل ہونا بہت بڑا اعزاز تھا۔ لاہور میں ان چار سالہ تعلیمی قیام نے ان کے فکر و فن کو بہت نکھارا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں قیوم نظر اور دیگر اساتذہ کی شفقت سے پاک ٹی ہاؤس، مختلف ادبی حلقوں کے پروگراموں میں اپنی غزلیں پیش کرنے لگے تھے۔

خواجہ محمد زکریا اورینٹل کالج میں چوں کہ خالصتاً ادبی ماحول میں ادبیات کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس لیے ان کے مزاج میں ادبیات کا راسخ ہونا ایک فطری امر تھا۔ سید عبداللہ جیسے استاد، جھنگ کی ادبی محافل، شعرا، ادبا سے تعلق داری اور ان کے ذہنی رجحان نے انھیں ایک اصول پسند استاد، ادیب، شاعر، نقاد اور محقق کے مقام تک پہنچا دیا۔ اورینٹل کالج میں ۳۷/برس باقاعدہ اور اب تک پروفیسر امیریٹس شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی اور خود نوشت کا سب سے زیادہ حصہ اس ادارے کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس ادارے کی اپنی انفرادیت تو ہے ہی ساتھ میں جامعہ پنجاب لاہور کا حصہ ہونا پوری دنیا میں خاص پہچان اور شان کا باعث ہے۔

جولائی سنہ ۱۹۶۳ء میں اورینٹل کالج میں بیرون ممالک سے آئے مبتدی طلبہ کے لیے استاد مقرر ہوئے۔ اس سے قبل گورنمنٹ کالج لاہور میں سات آٹھ ماہ کے لیے پڑھا۔ چکے تھے۔ پاکستان میں اب تک یہی اصول ہے کہ ملازمت سے قبل فٹنس

سرٹیفیکٹ کا حصول ضروری ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب نے میڈیکل فٹنس کے حصول کے لیے ڈاکٹروں کے روپے کو موضوع بنایا ہے کہ وہ کیسے رشوت یا کلینک سے چیک اپ کے لیے پریشان کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ مشق ابھی تک جاری ہے۔ خیر جولائی ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۹ تک مسلسل پندرہ سال تک اورینٹل کالج میں پڑھایا۔ ایک سال ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۰ تک بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی میں بطور صدر شعبہ اردو گزارا۔ ایک سال بعد دوبارہ واپس آئے۔ انھوں نے اپنی تدریسی خدمات کے دورانیے کی تفصیلات کچھ یوں درج کی ہیں:

> "یہ نو جولائی ۱۹۶۳ء کا دن تھا۔ اس دن سے ۳۱ جنوری ۱۹۷۹ء تک یعنی تقریباً پندرہ سال میں نے مسلسل اورینٹل کالج میں پڑھایا۔ یکم فروری ۱۹۷۹ء کو ملتان یونیورسٹی میں تقرر ہوا تو گیارہ ماہ کا عارضی وقفہ آیا۔ یکم جنوری ۱۹۸۰ء اورینٹل کالج واپس آ گیا اور پھر مزید بارہ سال یہیں پڑھایا۔ ۱۹۹۲ء میں گیارہ مہینے کے لیے چین گیا۔ پھر اورینٹل کالج میں واپسی ہوئی۔ تقریباً دو سال یہاں مزید کام کیا۔ یکم اپریل ۱۹۹۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۹۹ء تک جاپان میں پڑھایا۔ یکم اپریل ۱۹۹۹ء کو پھر اورینٹل کالج واپس آ گیا اور ۲۲ مارچ ۲۰۰۰ء کو یہیں سے بطور پرنسپل ریٹائر ہوا۔ اگر وقفوں کو شمار نہ کیا جائے تو اورینٹل کالج میں میں نے کل سینتیس برس کام کیا۔ شعبہ اُردو میں کسی دوسرے استاد نے اتنی طویل مدت نہیں گزاری۔"(۹)

خواجہ محمد زکریا کی اورینٹل کالج میں صدر شعبہ اردو، پرنسپل اور ڈین کے طور پر گزرے وقت کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ سینئر کی سازشی اور سیاسی روشیں، بڑے عہدے کے حصول کے لیے سازشوں کے تانے بانے، طلبہ تنظیموں کے اثر و رسوخ، بڑے ناموں والے چھوٹے ذہن کے اساتذہ کے کارناموں کو پیش کر کے اس عظیم درسگاہ کی تصویر کے دوسرے رخ کو نمایاں کرنا کسی دوسرے کے بس میں نہ تھا کیوں کہ ایسے عناصر کی بداخلاقی، بدزبانی اور دشمنی کی پروانہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اورینٹل کالج کے اساتذہ کس طرح من پسند طلبہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے کتنے قوانین و ضوابط کو پس پشت ڈالتے رہے۔ نمبروں کے حصول کے لیے خوشامدی اور موقع پرست بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے۔ اسی طرح بعض طلبہ منظور نظر ہونے کے لیے یا بہ امر مجبوری کس طرح کے مسائل سے دوچار ہوتے رہے۔ خواجہ زکریا صاحب کے بقول انھوں نے مقالہ جات کے نمبروں کے اصول بنائے تاکہ خوشامدی کلچر کی حوصلہ شکنی ہو اور طلبہ کے لیے آسانی ہو۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے لیکن ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد پرانی روشیں بحال ہو گئیں۔ اساتذہ کے غیر اخلاقی رویے اورینٹل کالج کے باب میں مذکور تعجب خیز ہیں۔

خواجہ محمد زکریا اصول پسند شخصیت ہیں انھوں نے کبھی بھی اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا چاہے اس کا نقصان ہو یا فائدہ۔ ان کی اس اصول پسندی کے پیش نظر انھیں ذہنی اذیتوں سے دوچار کرنے کے لیے انھیں تدریس کی بجائے مختلف کمیٹیوں کے ممبر بنایا جاتا رہا۔ ان رسمی کمیٹیوں کی آرا کو کبھی ترجیح نہیں جاتی تھی جو سب سے بڑھ کر اذیت ناک تھا۔ حتّٰی کہ ان کمیٹیوں کی سفارشات کے تناظر میں سنجیدہ و پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے سربراہان جامعہ اپنی چاکری بچانے کے لیے اور دباؤ کے عدم برداشت کی بابت چشم پوشی کی جاتی تھی یا یہ کہہ کر کہ یہ فیصلہ یونیورسٹی کی بدنامی کا باعث ہو گا ہمیشہ کے لیے دبا دیا جاتا تھا۔ ایک عام شخص تصور ہی نہیں کر سکتا کہ شعبہ امتحانات میں کسی طرح کے بددیانتی کی جاتی تھی۔ کلرکس رزلٹ کارڈ پر بغیر پرچہ جات کے نمبروں کے اپنی مرضی کا رزلٹ کارڈز میں نمبروں کا اضافہ کرتے تھے۔ اس ظلم پر خواجہ صاحب نے صدائے احتجاج بلند کی تو انتظامیہ نے بدنامی کے خوف سے اسے جوں کا توں رہنے دیا اور یہ سلسلہ جانے کب تک جاری رہا۔ خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی امتحانات کا نظام بہت خراب تھا۔ کنٹرولر امتحانات بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ بہت سے اہم لوگوں کو اس نے بہت فائدے پہنچائے تھے۔ جعلی ڈگریاں، گھر پر امتحان لے کر پرچے دیگر پرچوں میں شامل کر کے ممتحن کو بھجوانا، رزلٹ مرتب کرتے ہوئے ایوارڈ لسٹ سے Sheet پر رزلٹ منتقل کرتے ہوئے نمبر بڑھا دینا وغیرہ شعبہ امتحانات میں عام تھا لیکن چونکہ بعض اوقات یہ کام وائس چانسلر کی منشا سے کیے جاتے تھے اس لیے وائس چانسلر بھی چشم پوشی کرتے تھے۔"(۱۰)

"پتھر نہیں ہوں میں" ایک عہد کی داستان تو ہے ہی ساتھ میں ایک ادارے کی تاریخ اور روایت بھی ہے کیوں کہ آپ بیتی میں احوال حیات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تاریخ و تہذیب بھی بیان ہوتی ہے اس لیے زمانہ طالب علمی ۱۹۶۰ء (اورینٹل کالج سے ایم اے کا زمانہ) سے اب تک کے صدور شعبہ اردو، سربراہانِ کالج اور یونیورسٹی کے وائس چانسلرز کے اقدامات و اصلاحات کی اجمالی تاریخ و روایت جامع انداز میں تحریر کی ہے۔ کن لوگوں نے سابقین کی نیک و بد روایت کی تقلید کی کن لوگوں نے آمرانہ رویے کا مظاہرہ کیا اور کن لوگوں نے اصلاحات وجدت کے وسیلے سے اپنی حد تک معیار کے فروغ کے لیے کوشش کیں۔ سب باتوں کا احوال بغیر کسی لگی لپٹی آشکار ہو جاتا ہے۔ انھوں نے جامعہ کے حقائق و واقعات کو اس رنگ میں پیش کیا ہے جو نہ تو کسی تاریخ کا حصہ ہیں اور نہ ہی ان حقائق کے پیش کرنے میں کسی کو جرات تھی اور نہ کسی کے بس کی بات تھی۔ ساٹھ سال کے لگ بھگ کی تاریخ جیسے سب نظروں کے سامنے ہو۔ راقم کی طرح تمام قاری ایک بات شدت سے محسوس کریں گے کہ جس طرح ایک اصول پسند، ایمان دار اور راست گو کس طرح بے اصولی، بے ایمانی اور دروغ گوئی اور چاپلوسی جیسی حرکات سے کڑھتا ہے، صدمے سے دوچار ہوتا ہے، اسی رنج و قلق کا اظہار جابجا ان کی آپ بیتی میں نظر آتا ہے جو ان کی اصول پسندی، ایمان داری اور راست گوئی کا واضح ثبوت ہے۔

"پتھر نہیں ہوں میں" کا ایک حصہ سفر ناموں کا ہے جو انھوں نے چین، جاپان، بھارت، برطانیہ اور امریکہ، متحدہ عرب امارات جیسے ممالک میں سے بعض کے ایک بار اور امریکہ اور برطانیہ کے کئی بار سفر کیے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بیگم صاحبہ کے ساتھ سفر حج بھی کیا۔ ان سفر ناموں میں بھارت کے تین سفر ۱۹۷۷ء، ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۶ء میں کیے۔ سب سے زیادہ وہ امریکہ اور اس کے بعد برطانیہ کے سفر کر چکے ہیں۔ بطور استاد چین میں گیارہ ماہ اور جاپان میں چار سال پڑھا چکے ہیں۔ خواجہ صاحب نے بڑے اور ترقیافتہ ممالک کی سیر کی لیکن انھیں سب سے زیادہ پسند ملک جاپان لگا۔ انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ یہ سفر نامے روایتی سفر ناموں سے بالکل مختلف ہیں اور مختصر بھی لیکن کہیں کہیں وضاحت کے لیے چند جملے اضافی ہوں گے جس پر انھوں نے معذرت کی ہے۔ حالاں کہ کئی سفر ناموں کی مختصر کہانی ایک ایک کیضخیم کتاب سے زیادہ موثر اور دلچسپ ہے۔ اپنے ان سفر ناموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں سیاحت کا زیادہ شائق کبھی نہیں رہا۔ وجہ غالباً طبعیستی ہے۔ اس کے باوجود یہ دیکھنے کا شوق ضرور رہا ہے کہ بیرونِ پاکستان دیگر ممالک کے زمین و آسمان کو دیکھوں۔ اس لیے بعض ممالک میں جانے کے مواقع میسر آئے تو میں نے ان سے فائدہ اُٹھایا۔ میں جن ممالک میں کم یا زیادہ عرصے کے لیے گیا ان میں انڈیا (بھارت)، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، چین، جاپان، امریکہ اور انگلینڈ شامل ہیں۔ چین اور جاپان میں میں نے باقاعدہ ملازمت کی ہے اس لیے ان کے بارے میں ایک ایک مکمل باب الگ لکھا ہے۔ سعودی عرب میں حج کے لیے گیا تھا۔ اس کی کچھ تفصیل بھی ایک باب کا حصہ

بن چکی ہے۔ امریکہ میں نو دس بار گیا ہوں لیکن ہر بار قیام کی مدت لگ بھگ ایک ایک مہینہ رہی ہے۔ انگلینڈ کے بھی چند وزٹ کیے ہیں اور عموماً وہاں چند دن قیام کے بعد امریکہ چلا جاتا تھا۔ بھارت میں تین بار جانے کا موقع ملا ہے۔"۔(۱۱)

ان کی آپ بیتی کے آخری تین حصے میرا گھرانہ، میرا اپنا کنبہ اور اپنی تلاش میں، انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ میرا گھرانہ میں اپنے خاندان کی چند معلومات پیش کی ہیں اسی طرح اپنا کنبہ میں اپنے دو بیٹوں، بیٹی اور اپنی شریک حیات شگفتہ زکریا کی سانجھ کو موضوع بنایا ہے۔ شگفتہ سے ۲۵/ اگست ۱۹۶۸ء کو شادی ہوئی جو پیشے کے لحاظ سے لیکچرر تھیں۔ بڑا بیٹا فواد زکریا (پ:۱۹۶۹)، امریکہ میں مقیم ہے جب کہ چھوٹے بیٹے جواد زکریا (پ:۱۹۷۲ء) نے امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور مختلف ملازمتیں کیں اب والدین کے ساتھ مقیم ہیں۔ چھوٹی بیٹی صباحت زکریا (۱۹۷۸ء) وائس آف امریکہ سے اردو پروگرام کرتی ہیں اور وہیں مقیم ہیں۔ سب سے اہم آپ بیتی کا آخری حصہ اپنی تلاش میں ہے جس میں انھوں نے اپنی تمام زندگی کو ایک باب یا چند صفحات کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرح سے ان کی ادبی علمی اور سماجی زندگی کا خلاصہ ہے۔

جھنگ، لاہور میں قیام اور اورینٹل کالج میں ذمہ داریوں اور وابستگی کی بدولت ساٹھ سال کے عرصے میں بہت سے اساتذہ، شعرا اور ادباء و تخلیق کاروں سے ملنا جلنا رہا۔ ان میں سے کچھ بڑے نام تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کی شخصیت اور فن کو چند سطور میں ایسے پیش کیا ہے جو بلاشبہ ان شخصیات کی شخصیت و فن کے مقالے کے ملخص کے طور پیش کیا جا سکتا ہے۔ مجید امجد، عابد علی عابد، ناصر کاظمی، انتظار حسین، فارغ بخاری۔ وزیر آغا، جوش ملیح آبادی، صوفی تبسم، عدمؔ، حبیب جالب، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، یوسف حسین خاں، مالک رام، ممتاز مفتی، ضمیر جعفری،، جعفر طاہر، شیر افضل جعفری، صفدر سلیم سیال، رفعت سلطان، حکمت ادیب، بیدل پانی پتی، خلیق ملتانی، مرزا ادیب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مشتاق احمد یوسفی، عبد اللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ، منشا یاد، رشید امجد، مشفق خواجہ، احمد فراز، امجد اسلام امجد، قیوم نظامی جیسے شعرا اور تخلیق کاروں کے بارے ان کا جامع تبصرہ ملتا ہے۔ مذکورہ بالا شخصیات کی ترتیب یادرج ذیل میں چند شخصیات کے بارے تاثرات کسی خاص ترتیب کے بغیر پیش خدمت ہیں:

پروفیسر جابر علی سید

جابر صاحب بڑے عالم آدمی تھے۔ فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی ادب کا بھی وسیع مطالعہ کر رکھا تھا۔ علم عروض کے ماہر تھے۔ میں نے عروض سے کچھ آگاہی ابھی کی محفلوں میں حاصل کی۔ وہ ہر وقت کچھ سوچتے اور اپنے آپ میں گم رہتے۔ اس کیفیت میں بعض اوقات سلام کا جواب بھی نہ دیتے۔ جتنے عالم تھے اتنے اچھے استاد نہ تھے۔ دھیمی آواز تھی اور ناک میں بولتے تھے۔ جلد غصے میں آجاتے تھے۔ بعد ازآں، ان سے ملتان اور لاہور میں ملاقاتیں رہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔(۱۲)

ڈاکٹر وزیر آغا

پڑھے لکھے شخص تھے۔ اقتصادیات میں ایم۔ اے کیا تھا اور اُردو ادب میں طنز و مزاح پر پی ایچ ڈی۔۔۔ بطور نقاد ان کی اہمیت مانی جاتی تھی۔ کئی دیگر اصناف میں بھی خامہ آرائی ہے۔ میں اکثر لوگوں کی رائے کے برخلاف ان کی شاعری کو بھی اہمیت دیتا ہوں۔ وہ مجید امجد کی شاعری کو اہم مقام دینے والے اولین نقاد تھے حالانکہ اس زمانے میں مجید امجد کو بالکل نظر انداز کیا جاتا تھا۔(۱۳)

فرزند اقبال جسٹس جاوید اقبال

لوگ بہت زیادتی کرتے ہیں کہ انھیں علامہ اقبال کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں لیکن ان کی اپنی تحریریں اُردو ادب میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے تین حصوں میں علامہ اقبال کی جو سوانح عمری "زندہ رود" لکھی ہے ان سے بہتر اور جامع کتاب اقبال کی زندگی اور کارناموں پر نہیں لکھی گئی۔ انھوں نے بعض بہت عمدہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان کی خود نوشت بھی مجموعی طور پر اچھی ہے۔ کسی زمانے میں اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کی شخصیت میں تحمل اور قوت برداشت بہت تھی۔ آپ ان کے روبرو، ان پر شدید تنقید بھی کریں تو اس کا جواب بڑے منطقی انداز میں دیتے اور بالکل جوش یا غصے میں نہیں آتے تھے۔ ان کا مطالعہ بھی مختلف جہتوں میں تھا تاہم ان کے شعری ذوق میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔(۱۴)

تقی الدین انجم

تقی انجم بدایوں (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ سے ایم۔ اے (اُردو) کر رکھا تھا۔ رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کے شاگرد رہے تھے۔ اس زمانے میں بڑے خوش لباس تھے۔ اچھا مطالعہ تھا۔ انجم صاحب کلاس میں بے قاعدگی سے آتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے کلاس چھوڑنے پر تیار رہتے تھے شعر کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے اور بہت سے اشعار یاد تھے انگریزی ادب کا مطالعہ بھی کر رکھا تھا دو شعری مجموعے بھی چھپے لیکن بطور شاعر انھیں گنتی کے چند لوگ ہی جانتے ہوں گے۔(۱۵)

غلام محمد رنگین

جھنگ کے کہنہ مشق شاعر تھے۔۔۔ اردو میں شعر کہتے تھے لیکن رچناوی پنجابی میں پیروڈی کے ماہر تھے۔۔(۱۶)

پروفیسر محمد حیات سیال

حیات سیال مقامی کالج میں اردو کے استاد تھے۔ بہت محنتی متحرک اور مخلص دوست ۔۔کتابیں بڑے سلیقے سے مرتب کرتے۔ غالب حالی و جہی پر بہت اچھی کتابیں مرتب کیں۔(۱۷)

اسی طرح رفقا کارہ اساتذہ جیسے سید عبد اللہ، جابر علیسید، سجاد باقر رضوی، وقار عظیم، سہیل احمد خان، معین الرحمن، قیوم نظامی، ڈاکٹر محمد صادق، عبادت بریلوی، انوار احمد، عرش صدیقی، نجیب جمال، شفیق احمد، رفیع الدین ہاشمی میں بیش ترکے نہ صرف شان دار خاکے پیش کیے ہیں بلکہ ان کو بطور شخص و استاد اجمالاً موضوع بنایا ہے۔ ان کے بارے ایک دو سطری تجزیہ ان کی شخصیتکے سبھی نقوش واضح کرتا ہے: قاضی عبد الرشید جو خواجہ صاحب کے زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے، ان کا خاکہ:

"قاضی صاحب جیسا انسان کسی نے کم ہی دیکھا ہو گا۔ فزکس ان کا مضمون تھا لیکن سائنس کے اساتذہ ان کی علمیت سے منکر تھے۔ قاضی صاحب خوش پوش اور وجیہہ انسان تھے۔ بال سفید تھے جو ان کے سرخ و سفید چہرے پر بھلے معلوم ہوتے تھے۔ مبالغہ اور گپ ان کی طبیعت میں راسخ تھے۔ فرمایا کرتے تھے میں علامہ اقبال سے ملنے جایا کرتا تھا اور انھوں نے اپنے کئی اشعار کا مطلب مجھے بتایا تھا مگر اُن اشعار کی جو وضاحت کرتے بڑی مضحکہ خیز ہوتی۔ ان کی فزکس کی لیاقت دو واقعات سے ظاہر ہے۔

روس نے جب زمین کے گرد پہلا مصنوعی سیارہ چھوڑا تو اگلے دن جھنگ کلب کے ممبروں نے انھیں سائنس دان سمجھتے ہوئے کہا کہ روس کی اس عظیم کامیابی پر روشنی ڈالیے۔ . قاضی صاحب فورا بولے: یہ فراڈ ہے۔ روسی حکومت نے سائبریا میں ایک ریڈیو سٹیشن قائم کیا ہے اور وہاں سے سگنل دے کر دنیا کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ ایک ممبر نے کہا: قاضی صاحب استارہ خلا میں چھوڑنے کی تصدیق تو امریکہ نے بھی کی ہے۔ اس پر وہ بولے: "سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کلب کے پڑھے لکھے ممبروں پر کیا گزری ہو گی۔۔(۱۸)

ڈاکٹر محمد صادق

ان کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ تمام بال سفید تھے جو اچھے لگتے تھے۔ قد پانچ فٹ پانچ انچ کے قریب۔ سوٹ پہنتے تھے۔ ٹائی کا التزام کرتے تھے۔ سر سید اور ان کے عہد کے بارے میں ان کا علم قابل قدر تھا۔ واضح اور غیر مبہم رائے دیتے تھے۔ سخت گیر تھے۔ غیر روایتی نقطۂ نظر رکھتے تھے جو مجھے ان دنوں اچھا نہیں لگتا تھا۔۔"۔(۱۹)

ڈاکٹر وحید قریشی

اسلامیہ کالج سول لائنز میں لیکچرار تھے۔ عمر تقریباً پینتیس سال تھی۔ بے حد موٹے تھے۔ لمبا قد، سرخ سفید رنگ، ہاتھ میں کتابوں سے بھرا ہوا تھیلا۔ سائیکل پر آتے جاتے تھے۔ بعد میں ویسپا سکوٹر خرید لیا۔ فارسی شاعری کے رجحانات پر لیکچر دیتے تھے۔ مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ ان دنوں قوت برداشت بھی تھی اور تنقید برداشت کر لیتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر فارسی کے استاد تھے ان کے لیکچرز میں اچھی معلومات ہوتی تھیں۔۔(۲۰)

نتیجہ:

"پتھر نہیں ہوں میں" ایک عہد کی تاریخ و تہذیب کا نام ہے پروفیسر خواجہ محمد ذکریا اپنے زندگی کے ابتدائی ایام کی کہانی کے روپ میں ہمیں آزادی سے قبل ہندوستان کے باشندوں اور شہروں کی کہانی سناتا جاتا ہے بچپن کے انہی دنوں میں ہجرت کا صدمہ لیے لاہور شہر سے ہوتے ہوئے جھنگ شہر جا پہنچتے ہیں ان کی زندگی کی کہانی جاری ہے اور قاری ۴۷ء سے پہلے اور بعد کا ایک تقابل اپنے ذہن میں لیے کہانی سنتا جا رہا ہے۔ خواجہ محمد زکریا کی زندگی کی کہانیاں اور قصے اپنے متوازی کئی دنیائیں لیے ہوئے۔ اگرچہ ان کا سفر پنجاب سے پنجاب تک رہا لیکن یہاں نما جھنگ شہر کی ثقافت اور طرز حیات کا گہرا مشاہدہ اور ان کی تصویر کشی ان کی آپ بیتی میں نمایاں ہیں۔ اس خود نوشت میں ۷۳ سالہ اورینٹل کالج سے وابستگی کی ایک تاریخ اور اپنی زندگی کے کئی سفر نامے اس میں یکجا ہیں۔

یہ آپ بیتی بھی ہے، روایت و تاریخ بھی ہے، تذکرہ بھی جس میں پون صدی کے شعرا، اساتذہ، ادبا کا ذکر، تنقیدی اور شعری محفلوں کا بیان ملتا ہے۔ اسی طرح سیاسی شخصیات اور سیاسی حکومتیں بھی کسی نہ کسی حوالے سے موضوع بنائی گئی ہیں۔ تہذیب و معاشرت کی عکاسی بھی اور ایک کامیاب، اصول پسند استاد، شاعر، محقق و مرتب، نقاد کے سوانحی حالات کا مرقع ہے۔ بلاشبہ "پتھر نہیں ہوں میں" اردو آپ بیتی کے باب میں منفرد اضافہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ غلام رسول مہر، آپ بیتیوں کی اہمیت مشمولہ سہ ماہی نقوش، آپ بیتی نمبر، جولائی ۱۹۶۴ء، ص:۳۶

۲۔ علم الدین سالک، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو مطبوعہ سہ ماہی نقوش، آپ بیتی نمبر، جولائی ۱۹۶۴ء، ص:۴۰

۳۔ پروفیسر خواجہ محمد زکریا، پتھر نہیں ہوں میں، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۵ء، ص:۱۱

۴۔ ایضا، ص:۵۲۱

۵۔ ڈاکٹر امجد طفیل، خواجہ محمد زکریا: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۲۲، ص:۱۴۰

۶۔ ریحانہ خانم، فن آپ بیتی اور آپ بیتیاں مطبوعہ سہ ماہیالزبیر، بہاولپور، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء، ص:۹

۷۔ پروفیسر خواجہ محمد زکریا، پتھر نہیں ہوں میں، ص:۱۴

۸۔ ایضاً، ص:۳۴تا۳۵

۹۔ ایضاً، ص:۱۳۸تا۱۳۹

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۴۶

۱۱۔ ایضاً، ص:۴۲۵

۱۲۔ ایضاً، ص:۸۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۴۸۳

۱۴۔ ایضاً، ص:۴۸۲

۱۵۔ ایضاً، ص:۸۱۔۸۰

۱۶۔ ایضاً، ص:۵۳

۱۷۔ ایضاً، ص:۵۳

۱۸۔ ایضاً، ص:۸۲

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۰۶

۲۰۔ ایضاً، ص:۱۰۷